اشفاق احمد کے افسانوں میں صوفیانہ عناصر

تحقیقی وتنقیدی جائزہ

سیدہ طیبہ رباب
لیکچرار اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

AN ANALYTICAL STUDY OF MYSTIC ELEMENTS IN ASHAFAQ'S FICTION

Syeda Tayyiba Rubaab
Lecturer in Urdu
G.C. University, Faisalabad

Abstract

Ashfaq Ahamd is a great name of modern Urdu literature. He had special inclination towards mysticism. He travelled far and wide to meet mystics and interact with them in order to attain what we call Wisdom of the East. His literary contributions hold the very bearings of his mystic approach. He had the great love for humanity which is reflected through his short stories, dramas and interviews. This article is an analytical study of mystic elements in his fiction.

Keywords:

اشفاق احمد، اردو افسانہ، ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق، گڈریا، سفر مینا، ایک محبت سو افسانے، ملک مروت، سعید احمد، صائمہ غزل

اشفاق احمد کا حلقہ احباب ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق تک پھیلا ہوا تھا لیکن وہ خود کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے۔ان کا فن داخلی تحریک کا اظہار تھا۔ان دنوں افسانوی دبستان جنس نگاری سے مملو تھا۔جنس ایک فطری جذبہ ہے۔اسے بڑھا کر پورے ادب پر حاوی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اشفاق کا فن،لطیف جذبات واحساسات کو سموئے ہوئے ہے۔وہ جنسی جذبے کو شترِ بے مہار کی طرح نہیں چھوڑتے۔ان کے ہاں محبت کا جذبہ اتنا طاقتور ہے کہ وہ ساری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ان کے ہاں چاند کی چاندنی سے لے کر دریاؤں اور پہاڑوں پر پھیلے ہوئے نیلگوں گنبد پر کالی اور سفید بدلیوں کے سارے منظر بحرِ محبت میں غوطہ زن دکھائی دیتے ہیں اور پھر اشفاق محبت کے اس سمندر کا مشاہدہ کرتے ہوئے معرفت کے ساحل سے ہمکنار ہوتے ہیں۔جہاں ہر شے کے معنی بدل جاتے ہیں۔اس کائنات کا حسن ازلی ہی نہیں ابدی بھی ہے۔اب وہ صحرا کی وسعتوں میں انبیاء اور پہاڑوں میں اولیاء کے نقشِ قدم تلاش کرتے ہیں۔جہانِ معرفت تک کا سفر اشفاق نے کتنی حزم واحتیاط کے ساتھ کیا ہے۔ان کا دامن کہیں بھی خاردار جھاڑیوں میں نہیں الجھا۔ادب میں اتنی احتیاط روا نہیں لیکن روایت کی پاسداری ہی ہمیشہ زیبِ داستاں نہیں ہوا کرتی جب یکسانیت سے دم گھٹنے لگے تو کوئی روایت شکن پیدا ہو جاتا ہے۔ اشفاق کا جذبہ عشق ہوس سے آلودہ نہیں ہوتا کہ حسن کو رسوا کرنا شیوہ عشق نہیں۔ان کی محبت میں ادب واحترام بھی لازم ہے۔ان کا کوئی کردار محبوب کی عصمت کو تار تار کرتا دکھائی نہیں دیتا۔محبت ان کا ذاتی تجربہ ہے جس نے ان کی شخصیت کو ہفت رنگی عطا کی ہے۔یہ ان کے تجربے کی صداقت ہے جس نے محبت کو زندگی کے مختلف رنگوں میں لازوال حیثیت بخشی''اشفاق نے کسی مخصوص ماحول کو اپنے افسانوں کا موضوع اور پس منظر بنانے کی بجائے محبت کو اپنا موضوع بنا کر اسے گوناگوں رنگوں میں پیش کیا ہے۔ گھریلو زندگی میں ماں ،باپ، بہن، بھائی، آقا، ملازم کی محبت ایسی بلندیوں اور گہرایوں تک پہنچی ہے کہ اس محبت کا مظاہرہ کرنے والا سب کچھ محبت کے نام پر نثار کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔''(۱) اشفاق کا فن ان کی شخصیت کی طرح ارتقائی ہے۔جیسے جیسے ذہن ارتقائی منازل طے کرتا گیا ویسے ویسے قلب ماہیت ہوتی رہی اور اسی رفتار سے فن شخصیت کی عکاسی کرتا رہا۔ان کی شخصیت میں کتنے جہاں آباد تھے اور زندگی کے حقائق کو کس طرح اپنے اندر جذب کر کے اسے مختلف رنگوں میں بکھیرا یہ کچھ انھی سے مخصوص تھا''وہ عجب شخص تھا۔افسانہ نگار ڈرامہ نویس، شاعر، سکرپٹ رائٹر، دانشور، حکیم، فلسفی، صوفی، داستان گو، سفرنامہ نگار لیکن اس کی یہ ساری حیثیتیں رنگ وبو کے مرقعے کی طرح اس کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھیں۔بہت کچھ لکھنے اور بہت کچھ بولنے کے باوجود اس کی ذات میں عجب طرح کی پُراسراریت تھی اور یہی اسرار اس

کی شخصیت کا اعجاز تھا۔''(۲) اشفاق احمد کا فن عام انسان کی عزتِ نفس بحال کرتا ہے۔ وہ انسانی شخصیت کی تیسری منزل میں جھانکتے رہے جہاں روح کا خانہ ویران پڑا تھا۔ تاہم ان کا کوئی بھی رنگ محبت سے خالی نہیں۔ یہ محبت چونکہ جنس مخالف سے ہی مخصوص نہیں اس لیے یہاں لمس محبت کی معنوی تاثیر روح کی گہرائی تک اتر جاتی ہے۔ اگر کبھی جنس مخالف سے بھی مخصوص ہو تو یہ جذبہ تعظیم محبت کی تکفیر سے پہلے مینار سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔''اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت کا حسی تصور بے حد لطیف اور کثیر الاضلاع ہے۔ ان کے افسانے بظاہر محبت کے مرکزی نقطے پر گردش کرتے ہیں۔ تاہم ان کے موضوعات متنوع ہیں اور وہ محبت کی قندیل سے زندگی کے بے شمار گوشوں کو منور کرتے چلے جاتے ہیں۔''(۳) اشفاق کا احساس محبت روح کے گلزاروں میں بھی قدم فرسائی کرتا ہے۔ دراصل محبت اور روحانیت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ جس قدر محبت پاکیزہ ہو گی روح کے سفر کے آغاز میں اسی قدر آسانی اور روح کی پرواز میں اسی قدر ترفع ہو گا۔ محبت کے بغیر روح کی معرفت ممکن نہیں۔ اس کی حسین و دلفریب وادیوں اور خارزاروں سے گزر کر ہی روح کی منزل ملے گی۔ محبوب کی آنکھ جو کبھی عاشق کو بینائی عطا کرتی تھی، اب شراب معرفت کا ساغر بن جاتی ہے۔ اشفاق کا فن انھی کیفیات کا ترجمان ہے۔''ان کے فکر و فن کا دائرہ پھیلتے پھیلتے کائناتی وسعتوں کا حامل ہو گیا۔ زمینی حقائق کے بیان سے لے کر کائناتی حقائق کے انکشاف تک، اشفاق احمد نفسیاتی، روحانی اور مابعد الطبیعیاتی منزلوں کو مسخر کرتے اور قارئین ادب کے لیے فہم و فراست کے کئی زاویے روشن کرتے چلے گئے ہیں۔''(۴) افسانے کی نرم و نازک اور لطیف فضاؤں میں محبت میں گندھے ہوئے کردار اشفاق احمد کی پہچان ہیں۔ جہاں کچھ ناقدین نے اشفاق پر ادب میں اصلاح کے حربے کے استعمال کا الزام عائد کیا ہے کہ وہ فن نظر انداز کر گئے ہیں، وہیں پہ کچھ بلکہ بہت سے ناقد ان کے فن کا ہر صورت میں اعتراف کرتے رہے'' وہ جس ماحول یا کردار سے متاثر ہو کر افسانہ لکھتے ہیں اسے حد درجہ سبک، نرم، میٹھے، سادہ اور دھیمے لہجے میں قاری کے دل و دماغ میں اتار دینے کی کوشش کرتے ہیں، یہ نہیں کہ اصلاحی اور تعمیری مقصد ان کے یہاں نہیں ہوتا ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس طور پر نہیں کہ مقصد کا تبلیغی مشن آگے نکل جائے اور افسانہ پیچھے رہ جائے، وہ اپنے مقصد یا فلسفۂ حیات کو افسانے کی سطح پر تیرانے کی بجائے اسے معنی کی گہری تہوں میں اتار کر کہانی سناتے ہیں۔''(۵) ان کا افسانہ ''گڈریا'' اس تعریف پر پورا اترتا ہے۔ اس کی محبت کی گہرائی روح کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔''داؤ جی کے علم کا جادو محبت کے اسم اعظم کے طفیل بولتا ہے۔''(۶) ''گڈریا'' کرداری افسانہ ہے۔ داؤجی اس کا مرکزی کردار ہیں۔ افسانے کا پلاٹ داؤجی کے اردگرد گھومتا ہے۔ یہ اردو ادب کا شاہکار اور لازوال افسانہ ہے، جو حقیقی زندگی

کی تصویر کشی ہے۔ اشفاق احمد نے بڑی گہری محبت، دل سوزی اور فنکاری سے اس پیکر کو تراشا ہے۔ افسانے میں کوئی رومانوی قصہ نہیں پھر بھی اس قدر دلنشیں ہے کہ اردو ادب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ کردار ہندو مسلم کی تفریق کے بغیر انسانیت کو محبت کی لڑی میں پروتا ہے۔ محبت داؤ جی کی زندگی کا مرکز محور ہے۔ جذبے کی صداقت، مزاج کی نرمی اور روح کی لطافت داؤ جی کی محبت، صبر و تحمل اور بردباری کو روحانی ترفع سے ہمکنار کر کے ایک ایسا صوفیانہ کردار تشکیل دیتی ہے جو متصوفانہ نثر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مستقبل کا ادیب جب انسانی محبت کی داستان رقم کرے گا تو وہ اس کردار سے بے نیاز ہو کر آگے نہیں بڑھ سکتا بلکہ اس سے کسبِ فیض کرے گا۔ اس کردار کی تشکیل کے پس منظر میں صدیوں پرانی محبت کی وہ روایت سانسیں لے رہی ہے جس کے دم سے انسانیت کا بھرم تھا۔ خلوص، وفا، ایثار، مروّت، تحمل، برداشت، بردباری، انکساری اور فقر و استغنا، محبت کی چھلنی سے گزر کر پیکر خاکی میں ڈھلے تو داؤ جی کا کردار تشکیل پایا:

> ''گڈریا کے داؤ جی کا کردار ہند اسلامی تہذیب کی اس متصوفانہ روایت کا نمائندہ ہے جس نے گزشتہ ہزاریے کے دوران ہندوستان کے طول و عرض میں تہذیب و ثقافت کے نفیس ترین نمونے تیار کئے۔ ہندوستان میں تصوف کے جن سلاسل نے مذاہب کے فرق کو بھلا کر، انسانی روح کی تہذیب و تطہیر کو اپنا مقصود قرار دیا تھا، اس کے نتیجے میں ماں کی خواہش کے احترام میں زندگی بھر پگڑی کے نیچے چوٹی رکھنے والے، کھتری عرضی نویس چنت رام ان اعلیٰ انسانی اقدار اور گہرے رُوحانی ترفع کے پیکر بن جاتے ہیں۔ جو کسی بھی مذہب، کسی بھی تہذیب اور کسی بھی ثقافت کا مقصود اصلی ہوتا ہے''(۷)

اشفاق احمد نے اس کردار کی تخلیق میں اپنی ساری جذباتی قوتیں کھپا دی ہیں۔ یہ کردار ان کے گہرے مشاہدے اور ذاتی تجربے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ داؤ جی کی اپنے شاگرد ''گولو'' سے محبت بے مثال ہے جو میٹرک میں فیل ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر صاحب اسے داؤ جی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اشفاق بھی میٹرک میں فیل ہوئے تھے اور ان کے والد ڈاکٹر بھی تھے۔ اس لیے عین ممکن ہے یہ اشفاق کا ذاتی تجربہ ہو۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو کسی نہ کسی حوالے سے داؤ جی کا کردار ان کی حقیقی زندگی میں لازماً گزرا ہے۔ یہ زندہ کردار ہے جو محض تخیل کی کارفرمائی سے وجود میں نہیں آ سکتا۔ داؤ جی کا بظاہر بچپن کے گڈریا سے بڑھاپے کے گڈریا تک کا سفر دراصل ان کے روحانی ارتقا کا استعارہ ہے۔ ''گڈریا'' کا مرکزی کردار داؤ جی ابتداً ایک گڈریا تھا جو چرواہے کی دانش سے محروم محض گلے کا ایک جز و تھا، مگر پھر اسے ایک ایسا استاد مل گیا جس نے

اسے علم کے ذائقے سے آشنا کیا۔علم کا بہترین اظہار الفاظ میں ہوتا ہے اور استاد نے داؤ جی کو لفظ کی معیت میں سفر کرنا سکھا دیا۔لفظ ملا تو داؤ جی کے اندر سوئی ہوئی بزم افروزی کی لہک جاگ اٹھی اور وہ ایک داستان گو کے روپ میں معاشرے کی اصلاح، علم کے ہتھیاروں سے کرنے لگے.... مگر پھر یکا یک داؤ جی کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا ۔جب انھیں ترسیل علم کے منصب سے محروم کر کے دوبارہ بکریاں چرانے کا کام سونپ دیا گیا۔بظاہر یہ تنزل کی ایک صورت تھی لیکن اصلاً یہ ایک روحانی مقام کی طرف ان کی جست تھی کیونکہ وہ علم کو عبور کر کے عرفان کے دیار میں داخل ہو رہے تھے۔ان کی قلب ماہیت ہو رہی تھی۔وہ داؤ جی سے باباجی بن رہے تھے اور ان چرواہوں میں شامل ہو رہے تھے جو راستوں کو منور کر دیتے ہیں۔اشفاق احمد نے اپنے افسانے ''گڈریا'' میں اس قلب ماہیت کو کھول کر بیان نہیں کیا لیکن اس کی طرف ایک واضح اشارہ ضرور کر گئے ہیں۔افسانے کی آخری سطور ملاحظہ ہوں:

''جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا: چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں!

اور ننگے سر داؤ جی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فرید اچل رہا ہو۔''

فرید اسے ذہن فوری طور پر بابا فرید کی طرف منتقل ہوتا ہے اور پھر بابا جی اور بابا فرید ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔(۸) داؤ جی کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو ان کی ''گولو'' سے محبت ہے جو میٹرک میں فیل ہو چکا ہے۔تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتا، ڈاکٹر صاحب اسے داؤ جی کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن گولو پڑھائی پر آمادہ نہیں۔وہ کاروبار کر کے گاڑی لینا چاہتا ہے۔داؤ جی کہتے ہیں کہ اس گاڑی میں' میں بیٹھوں گا نہ ڈاکٹر صاحب۔گولو کہتا ہے کہ مجھے کسی کی پروا نہیں۔یہاں داؤ جی کا طرز تکلم سوز محبت سے بھرپور ہے۔

''انہوں نے حیران ہو کر پوچھا'' میری بھی پروا نہیں؟'' میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے۔''میری بھی پروا نہیں؟ او گولو میری بھی پروا نہیں؟''

مجھے ان کے لہجے پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا۔'' آپ کی تو ہے مگر۔''(۹)

پھر داؤ جی اپنے استاد کی یادوں میں کھو جاتے ہیں وہ گولو سے کم اور خود سے زیادہ مخاطب ہیں۔ استاد کو حضور اور آقا کے القاب سے نوازتے ہیں جنھوں نے چٹو کو منشی چنت رام بنا دیا ''داؤ جی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔داؤ جی! داؤ جی!؟ اور داؤ جی میرے آقا،

حضرت مولانا میرے مرشد" کا وظیفہ کیے جاتے۔"(۱۰) داؤ جی ہندو تھے اور ان کے استاد مسلمان جنھوں نے داؤ جی کو بکریاں چراتے ہوئے دیکھا تو دوسرے بچوں کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا۔ استاد کی محبت نے داؤ جی کو علم کے ساتھ محبت اور انسانیت بھی سکھائی اور چھتو کو اپنے رگ و پے میں اتار لیا اس کے بغیر ایک سال گزارنا پڑا' جب داؤ جی بغیر اجازت کے دلی کے ناصر علی سیتاتی کے پاس علم ہندسہ سیکھنے گئے جن کا پتہ خود استاد نے ہی دیا تھا اور کہا تھا کہ اب میرا اور تمھارا علم برابر ہو گیا اب میں نہیں پڑھا سکتا، لیکن یہ فرقت برداشت نہ کر سکے۔ یہی محبت داؤ جی اب گولو میں منتقل کر رہے تھے۔ گولو کا بستر داؤ جی کے گھر آ گیا۔ اسے محنت کا عادی بنا رہے تھے۔ گولو ان کے بہت قریب آ گیا یہاں تک جب وہ رات کو اٹھا کر فارسی ترجمہ کرنے یا فقرے کی ترکیب نحوی کرنے کو کہتے تو گولو گالیاں بھی دیتا۔ داؤ جی مطلوبہ کام کروانے کے بعد آئندہ نہ اٹھانے کا وعدہ کرتے اور ان کا لمس محبت گولو کو بہت کچھ سکھا جاتا۔ داؤ جی رات سونے سے پہلے گولو سے سوال کرتے جب وہ اُکتا جاتا تو چپ ہو جاتے پھر گولو کا ضمیر ملامت کرتا تو کہتا داؤ جی اب پوچھیں پھر داؤ جی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور بڑی دیر تک سمجھاتے رہتے۔ کبھی جوش میں گولو کو جان پدر کہہ کر مخاطب کرتے ایک بار گولو نے پوچھا آپ مجھے "جان داؤ" کیوں نہیں کہتے تو خوش ہو کر بولے اس لیے کہ "جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا۔ ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔"(۱۱) امتحان قریب آئے تو داؤ جی کی فکر بڑھ گئی گولو کو جیومیٹری اور انگریزی پراپوزیشن نہیں آتی تھی۔ اسے سمجھاتے رہے اور پڑھنے کی تلقین کر کے خود سو گئے۔ گولو متفکر تھا اس نے سوچا کہ داؤ جی کی عزت بچانے کے لیے مجھے رات کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ اسے پراپوزیشن یاد کرنا محال لگ رہا تھا۔ سیڑھیوں میں بیٹھ کے روتا رہا۔ سردیوں کی رات تھی جب جانے لگا تو داؤ جی کو سامنے کھڑے پایا جو اسے کہہ رہے تھے۔ "تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا۔' اور پھر دیر تک اسے پیار کرتے رہے اور اس کے اردگرد کمبل لپیٹ کر آئندہ نہ بھاگنے کا وعدے پر اس سے باتیں کرتے رہے کہ گولو باتوں کا رسیا تھا۔ داؤ جی اسلامی علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ بیٹی کی شادی پر جب اسے رخصت کیا تو خود بھی رو رہے تھے اور بیٹی بھی، دُور تک بیٹی کے ساتھ چلے اور اسے لاحول پڑھنے کی تلقین کرتے رہے۔ داؤ جی بے بے کی گالیاں سن کر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے۔ ان کے کرداری مطالعے سے انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کیا زمانہ تھا اور کیسے انسان تھے۔ جب کبھی گولو کو الجبرے کا سوال نہ آتا تو وہ گانے لگتا "تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نیوں دسنا" داؤ جی حیرت سے دیکھتے تو گولو قوالی شروع کر دیتا "نیوں نیوں نیوں دسنا تے دُکھ تینوں نیوں دسنا دسنا۔۔۔ نیوں نیوں نیوں نیوں۔۔۔ دسنا دسنا۔ سارے گاما رونا رونا رونا سارے گاما رونا رونا تے دکھ تینوں نیوں دسنا"(۱۲)

داؤ جی مسکراتے ہوئے آتے اور اپنا ہاتھ گولو کی تالیوں کے درمیان کھڑا کر کے محبت سے سوال سمجھاتے۔ یہ عنایت، یہ تحمل، یہ خلوص تو صوفیانہ صفات ہیں۔ داؤ جی صلہ وستائش سے بے نیاز گولو کو اپنا لیتے ہیں جو عام استادی سے کہیں آگے کی منزل ہے۔ انھوں نے گولو کے بہت نام رکھے ہوئے تھے۔ طنبورا، مسٹر ہونق، انخفش، اسکوائر اور کبھی غصے میں دُومنی کہتے۔ جب گولو امتحان دینے قصبے سے باہر جا رہا تھا، سب لڑکوں کے والدین انھیں چھوڑنے گئے تو گولو کے ساتھ داؤ جی تھے۔ سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ اسے سُنا رہے تھے اور سوال پوچھ رہے تھے۔ جس دن حساب کا پرچہ تھا۔ داؤ جی امتحانی مرکز پہنچ گئے۔ گولو بہت خوش تھا کہ اسّی نمبر کا پرچہ ٹھیک ہوا۔ داؤ جی کو دیکھتے ہی بھاگ کر ان سے لپٹ گیا اور اسّی نمبر کی رٹ لگا رہا تھا لیکن داؤ جی کو بیس نمبر کا دکھ تھا "داؤ جی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے "تو نے مجھے برباد کر دیا طنبورے" (۱۳) داؤ جی نے گولو کی ناکامی کو اپنی ناکامی سمجھ لیا تھا۔ اس ایک فقرے میں جو سوزِ محبت پنہاں ہے یہ داؤ جی کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ پیکرِ محبت جس کی زندگی ترسیلِ علم کے ساتھ وابستہ ہے جس کا ایک پل صدیوں پر محیط ہے۔ اُردو افسانہ اب نہ جانے کتنی دیر ایسے کردار کو ترستا رہے، لیکن گولو کے لیے داؤ جی کا دکھنا قابلِ فہم تھا۔ جب نتیجہ آیا تو گولو کی فرسٹ ڈویژن ایک نمبر سے رہ گئی۔ داؤ جی حلیم و بُردبار شوہر، محبت کرنے والے باپ، جانثار شاگرد اور فرمانبردار بیٹے بھی تھے۔ ان کے کردار کی خوبیاں آگے چل کر اشفاق کے سارے فن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ جیسے ان کی آغوشِ محبت گولو کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ایسے ہی اشفاق کا فن گڈریا کی آغوش میں سمٹ جاتا ہے۔ یہ ایسا کردار ہے، جو شکست کو بھی فتح میں بدل دیتا ہے۔ اگر چہ فسادات نے محبت کی شمعیں گل کر دی ہیں، لیکن داؤ جی اب بھی انسانیت کی راہنمائی کا کام اسی حلم و بُردباری اور محبت سے انجام دے رہے ہیں۔ "پھر فسادات چھڑ جاتے ہیں۔ عقل پر فرقہ واریت غالب آجاتی ہے۔ داؤ جی بھی دہشت پسندوں اور انسان دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ مغموم، ملول، دل گرفتہ لیکن شکست خوردہ ہرگز نہیں" (۱۴)

"ایک محبت سو افسانے" میں فہیم حساس بچہ ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سوالات پر بڑے بہن بھائی اسے ڈانٹ دیتے ہیں اور وہ ڈر کر خاموش ہو جاتا ہے۔ نانی اماں بچوں کو نانا کی شخصیت سے متعارف کروا رہی ہیں جو درویش منش اور آزاد طبع انسان تھے۔ جب ارادہ کر لیتے تو پھر کوئی انھیں روک نہ سکتا۔ اسی طرح ایک درویش کا ذکر سن کر اپنا گھر بار، نوکری چھوڑ کر، اس کی تلاش میں نکل گئے۔ متحمل مزاج اور بُردبار آدمی تھے۔ بچوں سے بڑی محبت سے پیش آتے کبھی سختی نہ کرتے۔ تین ماہ سے زیادہ گھر نہ ٹھہرتے۔ دل میں کچھ آتا اور بغیر زادِ راہ کے کسی سمت نکل کھڑے ہوتے اور واپسی پر کوئی درویش، کوئی

غریب یا کوئی جانور ساتھ لے آتے اوراس کی خدمت کرتے۔کبھی کوئی غریب عورت بچوں سمیت لے آتے اورانھیں کما کر کھلاتے۔''اس کے بچوں کے لیے کپڑے بنواتے'انھیں پڑھواتے اور جب کوئی اور وسیلہ اپنے سے بہتران کے لیے دیکھتے تو انھیں وہاں جانے کی تلقین کرتے۔''(۱۵) بھینس خریدی تو دودھ نہ دیتی تھی کہنے لگے یہ تو خوبصورتی کے لیے خریدی ہے۔اپنے کتے کے ساتھ بہت مانوس تھے۔جب وہ سردی سے ٹھٹھر کر مرگیا تو اس کے غم میں خود بھی بیمار پڑ گئے اور دنیا سے چل بسے۔آخری وقت چھوٹی بیٹی کو سینے پر لٹانے کی خواہش کی لیکن بیوی نے منظور نہ کی کہ بچی کو، کوئی متعدی مرض نہ چمٹ جائے۔بیوی نے روتے روتے سر ہلا کر انکار کر دیا۔اس پر وہ ہنسنے لگے۔''اچھا تمھاری مرضی!تمھاری مرضی!میرا دل اسے چومنے کو چاہتا تھا..... خیر خیر!''وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کرنے لگے''۔(۱۶) ایک صوفی کی طرح محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔انسانوں کے ساتھ جانوروں پر بھی مہربان تھے۔نانی اماں سناتی رہیں۔سب بچے سو گئے جب انھوں نے نانا کی وفات کا ذکر کیا تو صرف فہیم جاگ رہا تھا اوران کے سرہانے بیٹھا پھسک پھسک کر رو رہا تھا۔

سفر مینا

''سفر مینا'' کے افسانے ''بیا جاناں'' میں درویشی کی عیاری کوموضوع بنایا ہے۔حنیف، سادھو اور گیانی صوفی کا بہروپ ہیں۔باطن خواہشات سے آلودہ اور ظاہر میں ڈھونگ رچا رکھا ہے۔بظاہر نفس کو پامال کر رہے ہیں۔درحقیقت جنسی ہوس میں تڑپ رہے اور چاہتے ہیں کہ مطلوبہ لڑکی انھیں برگزیدہ ہستی سمجھ کر خود حاضر ہو جائے۔رانی کی باجی کچھ متاثر بھی ہوتی ہے اور ایک دن ان کے گھر آجاتی ہے۔اتفاق سے اس وقت وہاں طالب موجود ہے جو خود ان بہروپیوں کی گفتگو سے ورطۂ حیرت میں ہے۔وہ باجی کو بتاتا ہے کہ یہ لوگ آپ سے نہیں ملیں گے کیونکہ طالب کو ابھی ان پر شک نہیں ہوا۔تینوں اندر سے چلاتے ہیں۔لڑکی کو ماتا کہہ کے مخاطب کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کوئی کام یا مسئلہ ہے تو بتاؤ۔وہ واپس چلی جاتی ہے۔تھوڑے عرصے بعد طالب کو بادل ناخواستہ پھر اسی محلے میں آنا پڑتا ہے۔راستے میں رانی ملتی ہے جو بتاتی ہے کہ باجی فوت ہو چکی ہیں۔طالب، حنیف کے گھر جاتا ہے۔تو وہ گیانی اور سادھو کے ساتھ تاش کھیل رہا ہے۔اب طالب کو ان لوگوں کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ثمینہ شہناز لکھتی ہیں:

> ''اس افسانے میں اشفاق احمد نے یہ بیان کیا ہے کہ بعض لوگ اپنے اوپر نیکی اور پارسائی کا خول چڑھا لیتے ہیں اور بعض صرف اپنے مقاصد کے حصول کے لئے پارسائی کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔اس افسانے میں حنیف، سادھو اور گیانی ان تینوں کرداروں نے بھی ایک لڑکی کو متوجہ کرنے کی خاطر تصوف کا لبادہ اوڑھا اور جب لڑکی اس جہان فانی سے کوچ کر گئی تو

انہوں نے اپنے نام نہاد تصوف کے لبادے کو چاک کرنے میں کوئی تاخیر نہ کی۔"(۱۷)

یہ تینوں کردار خود فریبی کی کوشش میں ہیں۔اشفاق احمد نے بڑی بے دردی سے ان کی حقیقت کو آشکار کیا ہے۔"حنیف سجدے میں گر کر چٹائی کو دونوں ہاتھوں سے نوبت کی طرح بجا رہا تھا اور سانپ کے پھن کی طرح آدھا دھڑ زمین سے اٹھا اٹھا کر فریاد کر رہا تھا۔

بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوہ جانبازاں
بہ صد سامان رسوائی سر بازار می رقصم

اس شعر کا ورد کرتے کرتے وہ سجدے سے اٹھا اور کوٹھری میں پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا۔پھر اس نے اپنا گریباں چاک کر ڈالا اور اپنے چہرے کو طمانچوں سے لال کر دیا۔"(۱۸) صوفی کی شخصیت میں تو بڑا صبر اور ٹھہراؤ ہوتا ہے۔اسے اس طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ رقص سے مراد یہ سب کچھ ہے جو اس طرح کے بہروپیے کرتے ہیں۔تصوف کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یا عوام کو دھوکہ دیا جاتا ہے اشفاق احمد اپنے فن کے ذریعے ان لوگوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس طرح اس طبقے کو بھی جواب مل جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ صوفی کی یا "بابے" کی پہچان کیا ہے اور بابے غلط بھی ہوتے ہیں۔تو اس کا جواب یہی ہے اصل کی نقل ہر جگہ پر موجود ہوتی ہے اور اسے دیکھنے کے لیے چشم بصیرت کی ضرورت ہے۔جو تزکیۂ نفس کی بدولت ملتی ہے اور جب یہ ہو تو انسان خود بابا بن جاتا ہے۔

"ملک مروت" طلسم ہوش افزا کا دوسرا افسانہ ہے۔اس کا کردار دانیال کے گھر سے نکلتا ہے۔ راستے میں اسے یاد آتا ہے کہ اس کا کیمرہ کھڑکی میں کھلا پڑا ہے وہ اپنے خیال کو کھڑکی پر مرتکز کر کے ایک لیزر بیم مارتا ہے اور سوچتا ہے کہ کھڑکی اس عمل سے بند ہو گئی ہو گی وہ گھوڑا گلی جاتا ہے۔واپسی پر دھند اور کالے بادل ہیں اسے راستہ دکھائی نہیں دیتا اور نیچے کی بجائے وہ اوراوپر چلا جاتا ہے جہاں اسے چٹیل میدان دکھائی دیتا ہے۔وہ گاڑی کی رفتار بڑھانا چاہتا ہے لیکن ایک خوبصورت بزرگ اسے روک دیتا ہے کہ یہ میدان نہیں گہری کھائی ہے۔بزرگ کے کہنے پر دانیال اس کے گھر جاتا ہے۔نیم پلیٹ پر اس کا نام ملک مروت لکھا ہے۔یہ گھر بہت ہی پُرسکون ہے۔کمرے کی فضا خوشگوار ہے۔دانیال بزرگ کی مہمان داری سے بھی متاثر ہوتا ہے۔واپسی پر وہ بزرگ دانیال کی گاڑی دشوار کھائی سے گزار کر پکی سڑک تک لے آتا ہے۔دانیال ملک مروت کی محبت سے اس قدر مسحور ہوتا ہے کہ سامنے سے آنے والے ٹریکٹر کو نہیں دیکھ سکتا۔اس کی گاڑی بیس فٹ گہرے نشیبی نالے میں گر جاتی ہے۔ہسپتال سے پٹیاں بندھوا کر باہر نکلتا ہے تو سامنے ملک مروّت ہے جو اسے بازوؤں میں لے لیتا ہے اور بتاتا ہے کہ بیل نے اس کا اصل نام چھپا رکھا تھا وہ ملک مروت نہیں بلکہ ملک الموت ہے۔دانیال وقت سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔اس لیے وہ

چھوڑنے آیا اور اب وقت پورا ہو چکا ہے۔ اس افسانے میں اشفاق احمد نے روحانی اسرار کو سمویا ہے۔ موت کی حقیقت بتائی ہے کہ وقت سے پہلے نہیں آتی بلکہ خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ ملک الموت کو بہت مہربان اور ملنسار دکھایا ہے شاید وہ موت کا خوف ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ''ملک مروت'' کا ملک الموت ہونا افسانے کو پُراسرار بنا دیتا ہے۔

''سونی'' میں معاشرے کے اونچے طبقے کی کہانی ہے۔ فجستہ اور بختیار امیر ترین گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں شادی کے بعد ولائت ہنی مون منانے جاتے ہیں۔ اس کے بعد سمجھوتے کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بختیار کو کاروبار کے سلسلے میں کہیں جانا ہے۔ فجستہ اس سے Sony مانگتی ہے۔ بختیار کو Sony سے بڑی محبت ہے جو اس کا وی سی آر ہے۔ لہٰذا وہ انکار کر دیتا ہے۔ فجستہ حیران ہوتی ہے۔ وہ سُرخ فراری سے بھی ایسی ہی محبت کرتا ہے۔ فجستہ کی ضد پر اسے سونی دے دیتا ہے۔ کئی مہینوں کے بعد واپسی ہوتی ہے تو ''سونی'' کی حالت دیکھ کر افسردہ ہوتا ہے حالانکہ فجستہ اسے گرمجوشی سے ملتی ہے۔ سونی اسے بتاتا ہے کہ فجستہ بے وفا ہے۔ وہ فجستہ اور اس کے دوست مسعود کی فلم بختیار کو دکھاتا ہے۔ بختیار نمناک آنکھوں سے سونی کو لے کر تہہ خانے میں چلا جاتا ہے۔ فجستہ سے کچھ نہیں پوچھتا۔

اس افسانے میں اشفاق احمد بتانا چاہتے ہیں کہ اونچا طبقہ بے روح، مادی آسائشوں کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ انسان کو انسان سے محبت نہیں۔ اس کی کمی وہ بے جان کے ساتھ محبت سے پوری کرتا ہے پھر بھی خالی دامن رہتا ہے۔ ''سعید جونیئر'' میں سعید احمد کے والد ایک نیک اور صوفی منش انسان ہیں۔ غربت میں بسر ہوتی ہے لیکن طبیعت میں ہوس، لالچ یا رزق حرام کی تمنا نہیں۔ سعید احمد فرسٹ ایئر میں ہے کہ والد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ سعید کی والدہ لوگوں کے بچوں کو قرآن پاک پڑھا کر اور باورچن کا کام کر کے اسے بی اے کرواتی ہے۔ سعید احمد کو چنگی کے محرر کی نوکری ملتی ہے وہ رزق حرام کی طرف مائل ہو کر رشوت خور بن جاتا ہے۔ اس کی طبیعت میں لالچ نہیں لیکن طبقہ اشرافیہ میں شامل ہو کر عزت پانا چاہتا ہے۔ ماں کو پتہ چلتا ہے تو اپنے برتن الگ کر لیتی ہے۔ آہستہ آہستہ سعید مزید گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نجومیوں، عاملوں، جوگیوں سے رابطہ کر کے انعامی بانڈ اور لاٹری کے ذریعے دولت کا خواہشمند ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ ماں اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ سعید اپنے باپ کے اوراد و وظائف میں سے وظیفے منتخب کرتا ہے اور انھیں اپنا معمول بنا لیتا ہے لیکن گناہوں سے باز نہیں آتا۔ اس کی لاٹری یا بانڈ تو وظیفے سے بھی نہیں نکلتے لیکن اوراد اس کا معمول بن جاتے ہیں۔ سردیوں کی ایک طویل رات جب وہ تسبیح پڑھ رہا تھا تو اس نے پونے دو فٹ کا ایک بہت ہی خوبصورت انسان دیکھا جو اس سے ملتا جلتا تھا۔ سعید احمد

کے استفسار پر اس نے بتایا کہ میں تمھارے وظائف کی صورت سعید جونیئر ہوں۔تمھارے اعمال تو ٹھیک نہیں ہو سکے لیکن تمھارے وظائف اللہ تک پہنچتے رہے وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ میں انھی وظائف کا انعام ہوں نیز یہ بھی کہ میں غلمان کا دوست اور حضرت یوسفؑ وحضرت زکریاؑ کا خدمتگار ہوں۔تم انعامی بانڈ کے لیے وظائف کرتے ہو وہ سب عرش پر کھلے پڑے ہیں۔لیکن ہم اس طرف توجہ نہیں کرتے۔اس پر سعید احمد اس کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے کہ میں نے سب کچھ بانڈ اور لاٹری کے لیے کیا اور تم میرے ہی وظیفے کی صورت ہو مجھے انعام نکلنے والے نمبر بتاؤ ورنہ میں تمھارا بُرا حشر کروں گا۔سعید جونیئر معذوری ظاہر کرتا ہے تو سعید احمد اسے سختی سے دھتکار دیتا ہے۔

اس افسانے میں اشفاق احمد یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک طرف تو غربت گناہ پر مجبور کرتی اور دنیاوی رسوائی کا سبب ہے، معاشرے میں عزت دولت کی وجہ سے ملتی ہے تو دوسری طرف دولت کا طلبگار گناہوں میں آلودہ ہو جاتا ہے۔وہ نیکی بھی حصولِ دولت کے لیے کرتا ہے اور سعید جونیئر کی صورت میں جو اسے انعامِ خداوندی ملتا ہے، اسے ٹھکرا دیتا ہے۔یہ اس کی بدبختی کی علامت ہے۔سعید احمد، جونیئر سے کہتا ہے:

> ''تم مجھے اچھی طرح سے جانتے ہو جونیئر کہ تم میرے ہی وجود کی تقلیل ہو اور میری ہی روح
> کی تخفیف ہو۔اگر تم نے میری حکم عدولی کی اور میری خواہش پوری کرنے سے انکار کیا تو
> میں تم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔تمھیں تڑپا تڑپا کر اور ترسا ترسا کر ختم کر دوں گا۔''(۱۹)

سعید احمد کی ماں کا کردار قابلِ تحسین اور روحانی اقدار کا پاسدار ہے جو برائی میں اپنے اکلوتے بیٹے کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ اپنے خاوند کی نیک روح کو یاد رکھتی ہے۔''آخری حملہ'' میں راحیلہ ڈفتھیریا کی مریض ہے۔ڈاکٹر اس کے علاج سے مایوس ہو چکے ہیں۔ماں غم کی تصویر بنی اس کے سرہانے بیٹھی رہتی ہے۔ اس کے اندر کثیر تعداد میں جراثیم ہیں۔جراثیموں کا مارشل پیتھیو جینک خان ان کی کارکردگی پر برس پڑتا ہے۔انھیں پسپائی کے طعنے دیتا ہے۔جراثیموں کی فوج کا کرنل وضاحت کرتا ہے کہ وہ کئی محاذوں پر لڑ رہا ہے۔لیکن اس بظاہر کمزور سی لڑکی میں سفید خلیے بہت زیادہ تعداد میں ہیں جو جراثیموں پر حملہ آور ہو کر انھیں مار دیتے ہیں۔مارشل غصے میں اپنی فوج کو تیار کر رہا ہے کہ اسی بحث کے دوران سفید خلیے حملہ کر کے جراثیموں کا خاتمہ کر دیتے ہیں اور راحیلہ نئی زندگی پاتی ہے۔

اشفاق احمد نے راحیلہ کے جسم کو میدان کارزار بنا کر جراثیموں اور سفید خلیوں کو مدمقابل افواج کی صورت میں پیش کیا ہے۔جراثیم حملہ کرتے ہیں تو سفید خلیے دفاع کرتے ہیں۔راحیلہ کے منگیتر کا کردار بھی اہم ہے۔اس کی محبت راحیلہ میں زندگی کے آثار پھر سے پیدا کرتی ہے۔یہ جراثیموں اور سفید

خلیوں کی جنگ انسان کے خیروشر کی پیکار کے مترادف ہے۔انسان کے باطن میں اسی طرح شر کی قوت خیر پر حملہ آور ہوتی ہے۔یہاں محبت بھی ایک لازوال قوت کا کام کرتی ہے۔اس کی مدد سے خیر کی قوت شر کو شکست سے ہمکنار کرتی ہے۔جیسے افسانے میں سفید خلیے حملہ آور ہوتے ہیں۔

''ابھی مارشل یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ اردگرد کھڑے ہوئے خون کے سفید خلیے ان پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے دیکھتے کڑچ کڑچ کر کے ان کو نگل گئے۔''(۲۰) سفید رنگ خیر کی علامت ہے۔یہ سفید خلیے بھی خیر کی طاقت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان کی فتح اس سائنٹفک افسانے میں روحانیت پیدا کرتی ہے۔صائمہ غزل لکھتی ہیں:

> ''اشفاق احمد نے بڑی فنی چابک دستی اور حکیمانہ فکر کے ساتھ افسانے کے پلاٹ اور کہانی کو بہت جاندار بنادیا ہے۔اسلوب یہاں بہت شگفتہ اور تازہ معلوم ہوتا ہے۔اشفاق احمد کا یہ افسانہ روحانی سائنس کی بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے''۔(۲۱)

اشفاق احمد نے جراثیموں اور سفید خلیوں کو مجسم کردار بنا کر تمثیل نگاری سے کام لیا ہے۔

''صبحانے فسانے'' میں ''اماں سردار بیگم'' کا کردار صوفیانہ ہے۔یہ کردار افسانوی نہیں، حقیقی ہے۔اشفاق احمد کی اماں میں عجز وانکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔اپنے بچوں کی کثرت اور لیاقت پر نازاں نہ تھیں بلکہ ان کا بس چلتا تو اپنے بچوں کو گمنام کر دیتیں۔ماں نے بچوں کی پرورش کے ساتھ ان کی اخلاقی تربیت بھی کی۔ڈاکٹر کی بیوی تھیں لیکن گھر کا سارا کام خود کرتیں بلکہ مویشیوں کو چارہ بھی ڈالتیں۔ مہمانوں کو باعث برکت سمجھتیں۔جب اپنے بچوں کے لیے دعا کرتیں تو پہلے کل جہاں کے بچوں کی خیر مانگتیں اور پھر ان کے طفیل اپنے بچوں کی۔چلچلاتی دھوپ میں خوشی سے کام کرتیں۔باسی سالن بھی شکر گزاری سے کھالیتیں اور کچے تربوز بھی۔اولاد کی تربیت کا یہ انداز کہ آپا کی مضمون نگاری کی تعریف ہوئی تو کہا کہ جس کی سب تعریف کریں اسے شرم آنی چاہیے۔روس کی تباہی کی پیش گوئی انھوں نے پہلے ہی اپنے توکل اور یقین کی بنا پر کر دی تھی اور پھر بے بصیرت شوہر کے کہنے پر اولاد سے اس بات کی معافی طلب کرنے کو بھی تیار ہوگئیں۔اماں نے وفات کے بعد اپنی قبر کا نشان بھی مٹا دیا۔یہ عجز، یہ تسلیم و رضا، یہ صبر وشکر اور خدمتِ خلق اماں کے صوفیانہ کردار کی خصوصیات ہیں جو اشفاق کو ورثے میں ملیں۔''پوری جان کاری'' میں ہڑپہ سے سات میل دور جنوب کی جانب ''ماہڑا'' نامی ایک بستی دریافت ہوئی جو ہڑپہ سے بھی دس ہزار سال قدیم ایک آبادی تھی۔جوزف کی بیوی کیرولین نے اسے دریافت کیا۔اس دریافت پر جوزف بہت خوش تھا۔تحقیق سے پتہ چلا کہ یہاں کے لوگ سائنسی علوم میں باکمال تھے۔سائنس اور

ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانوں کولذت کے نشے میں مدہوش کر دیا تھا۔اقتصادی مسائل نہ تھے۔جدید ذرائع آمدورفت تھے۔جنسی آزادی تھی۔تمام مردوعورتیں ایک دوسرے کوجنسی طور پر جانتے تھے۔اگر کوئی چیز نہیں تھی تو محبت نہیں تھی، نہ عاشق تھانہ معشوق۔صرف پانچ لوگ ایسے تھے جو تجسس اورتحیر میں مبتلا تھے۔یہ شاعرادیب تھے۔ماہڑا کی تہذیب میں سائنسی ترقی آج کے دور سے کہیں زیادہ ہے۔اس کے کھنڈرات سے ایک تختی ملی اسے جب میگنیٹک فیلڈ سے گزارا جاتا ہےتو ایک آواز آتی ہے۔''آہ ہم کوعلم کی فراوانی اور دانش کی افراط اورحیرت وتحیر کی نایابی نے برباد کیا! کاش ہمارے سائنسی پروہت اورفنی کرمچاری....''(۲۲)اس کے بعد فقرہ مکمل نہیں ہوتا۔آواز ڈوب جاتی ہے۔سگنل آتے ہیں لیکن الفاظ سمجھ نہیں آتے۔کیرولین اس تختی کولیکر ایم آئی ٹی کی لیبارٹری میں پہنچ چکی ہے۔جوزف کہتا ہے کہ کیرولین بکواس کرتی ہے۔وہ تختی کی آواز سننے نہیں گئی بلکہ اپنے پرانے یار سے ملنے گئی ہے تا کہ دونوں میگنیٹک فیلڈ سے گزر کر دیکھیں کہ دونوں کے درمیان کس قدر محبت باقی ہے۔جوزف کا خیال ہے کہ کیرولین واپس نہیں آئے گی۔اب جوزف کی غیر ملکی امداد بند ہو چکی ہے۔وہ فقیرانہ زندگی بسر کر رہا ہے،مگر تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔اس افسانے میں اشفاق احمد نے جدید سائنسی معاشرے پر طنز کیا ہے جو سائنسی ترقی کے باوجود اخلاقی تنزل کا شکار ہے۔مادی ترقی اور ظاہری علوم کی زیادتی نے انسان کو تباہ کر دیا ہے۔یہ احساس آنے والے دور میں بڑھے گا جب مزید سائنسی ترقی ہوگی اور معاشرے میں صرف چند افراد ہی تحیر اورتجسس میں مبتلا ہونگے جو مادی ترقی کی دوڑ میں پڑنے کی بجائے فطرت کے قریب ہوں گے۔

''ڈھور ڈنگر کی واپسی'' ایسا افسانہ ہے جو نائلہ کی سمت تبدیل کر دیتا ہے۔نائیلہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور بہت اچھی مصور ہے۔سلیمان، نائلہ کے حسن یا فن سے نہیں اس کے کھلے ڈلے پن اس کی بے حجابی اور جرأت سے متاثر ہے۔وہ ایک بڑے زمیندار، سیاسی گھرانے کا فرد ہے۔نائلہ بھری محفل میں مذہب کے بارے میں آزادی سے اظہارِخیال کرتی۔اس کے پاس خدا کے نہ ہونے کی سترہ طاقتور دلیلیں تھیں۔جن میں سے دو اس کی ذاتی اور باقی مفکرین کی تھیں۔وہ جدیدیت میں رنگی ہوئی مذہب تو کیا فطرت سے بھی دور تھی۔محبت کی قائل نہ تھی۔وہ خودمختار اور غیر متعصب تھی۔آخر نائلہ اور سلیمان کی شادی ہو گئی اور وہ سلیمان کے گاؤں چلی گئی۔اس کا لباس سب سے الگ ہوتا۔گاؤں کی عورتیں اس کی عاشق ہوگئیں۔نائلہ بزرگوں کے منہ پر وہ بات پھٹاک سے مارتی جو روائتی عورتیں کبھی نہ کرسکتیں۔وہ دل ہی دل میں خوش ہوتیں۔نائلہ نے ان عورتوں کو پیروں فقیروں کے پاس جانے اور خاوندوں کی ہر بات ماننے سے روک لیا تھا۔ان کے ذہن تبدیل کر دیے۔وہ گاؤں میں ایسی مگن ہوئی

کہ اپنے میکے کو بھول گئی۔ایک شام وہ حویلی کی پردوں والی چھت پر ہاکو مصلّن کا نیو ڈسکیچ بنا رہی تھی۔ بار بار اس کے ذہن میں خیال آتا کہ Figure کہیں اور سے آتی ہے۔ڈائننگ کرنے سے نہیں ملتی۔''وہ چوکی پر بیٹھی ہوئی ہاکو کے کالے سیاہ بدن اور کھلے ہوئے گھنیرے بالوں کو دیکھتی دیکھتی ٹرانس میں چلی گئی۔اس کا سکیچ اچھا بنا تھا۔لیکن ہاکو کے بدن جیسا نہیں۔اس کی آؤٹ لائن بڑی زوردار تھی لیکن ہاکو کی جلد جیسی نہیں تھی۔اس کے چہرے کے سارے خدوخال ہاکو کے تھے اور مشابہت سو فیصد تھی لیکن وہ ہاکو نہیں تھی۔''(۲۳)

ہاکو کے خدوخال نے نائلہ کے ذہن اور اس کے تصورات کو ہلا کے رکھ دیا۔شام کا وقت تھا۔ نائلہ نے پہلی بار اتنا کھلا اور صاف شفاف آسمان دیکھا تھا۔پھر درختوں کے جھنڈ اور دور تک پھیلا ہوا میدان یہ مناظر نائلہ کے فنکار ذہن میں ایک انقلاب برپا کر گئے اور پھر شام کے دُھندلکے میں مویشیوں کی گھروں کو واپسی۔گائے، بھینس، بکریاں، بھیڑیں اور اونٹ، ڈوبتا سورج گویا ان کے مالکوں کو خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔اسی دوران نیم پختہ مسجد سے مغرب کی اذان آئی تو نائلہ نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔اس کا سارا بدن سسکیوں سے ہلنے لگا۔پھر اچانک گلی میں شور ہوا لوگ تالیاں بجا کر ہنس رہے تھے۔''سندر میو کی جوان بچھیا نائی خورشید کا گلے سے بچھڑا ہوا لیلا جنگل سے لے کر آ رہی تھی اور اسے اپنے بے سینگ گھونے سر کی ڈھڈیں مار مار کر سیدھے راستے پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی.....۔

''نائلہ نے سوچا، کیا میں سلمان سے جا کر یہ نہ کہوں کہ میں بھی نائی خورشید کا بھٹکا ہوا لیلا ہوں اور مجھے بھی اپنے باڑے تک پہنچنا ہے اور مجھ سے بھی میرا راستہ گم ہو گیا ہے۔''(۲۴) لیکن سلیمان فضول کاموں میں مصروف تھا۔اس سے بات کرنا بیکار تھا۔نائیلہ چھت پر ہی بیٹھ گئی اور منہ اوپر اٹھا کر بولی''میں تو جو تھی سو تھی،تو نے بھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ اس نماز میں کتنی رکاتیں ہوتی ہیں اور کس میں کیا پڑھتے ہیں،پر اب میں نے بھی تیرا پیچھا نہیں چھوڑنا۔''(۲۵)اور پھر نائیلہ بھی ڈوبتے سورج کی شفق میں کھو کر اسی منظر کا حصہ بن گئی۔

اشفاق احمد نے نائلہ کی باطنی تبدیلی کو بڑے موثر پیرائے میں بیان کیا ہے بے شک وہ خدا کی منکر اور مذہب سے بیزار ہے لیکن اس کے باطن میں مکر وریا،منافقت اور آلودگی نہیں۔وہ مناظر فطرت کی نقاش ہے۔یہی نقوش جب وہ ان کی حقیقی صورت میں دیکھتی ہے،تو اس کا ذہن نقاش حقیقی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔اسی لمحے اذان کی آواز اس کی روح پر اثر انداز ہو کر اسے خدا پرست بنا دیتی ہے۔

''دم بخود''میں مادھو کے مرنے میں صرف چند گھنٹے باقی ہیں کہ اس کی جوان بہن گائتری سڑک پر ننگے پاؤں کھڑی ہے۔اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔مادھو کو سینے سے لگایا ہوا ہے اور ہاتھ میں پانی کی

بھری ہوئی شیشی ہے۔مغرب کی نماز کے بعد نمازی مسجد سے نکلے تو سب نے پانی پر پھونک ماری اور بزرگ گائتری کے سر پر ہاتھ رکھ کر دلاسے دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔اگلے دن مادھو حیرت انگیز طور پر ابھی زندہ تھا۔سب نے پھر مادھو کو پھونک ماری اشفاق نے بھی اس کے پانی پر دم کر کے پھونک ماری ساتھ ہی گائتری کے منہ پر بھی پھونک ماردی۔وہ بہت خوش تھی۔اس کا بھائی بچ گیا۔اس وقت اشفاق نویں میں پڑھتے تھے، پھر وہ کالج چلے گئے۔چھٹیوں میں واپس آئے تو گائتری کے گھر جھانک کر اندر داخل ہوئے۔اس کے باپ ماتھر جی نے اشفاق کو آواز دی۔ماتھر جی حکمت جانتے تھے اور مریضوں کا علاج کرتے تھے لیکن مادھو کو ان سے نہیں بلکہ نمازیوں کے دم سے شفا ہوئی تھی۔آج ماتھر جی نے کاڑھا بنایا تھا۔اسے چھاننے کے لیے ایک طرف سے کپڑا اشفاق کو پکڑایا دوسری طرف سے گائتری کو اور کاڑھا چھاننے لگے۔اس دوران اشفاق سے باتیں کرتے جاتے۔اشفاق نے ماتھر جی سے دم کروانے کی حقیقت پوچھی تو بولے کہ جب انسان اپنا آپ بھگوان کے حوالے کر دے تو اس کی رضا بھی بدل جاتی ہے۔''ہم سے تو یہ کام نہ ہوسکا نہ مجھ سے نہ اس کی ماں سے، پر گائتری نے بینتی کر کر کے بھگوان کی اچھیا بدلوالی''(۲۶) اس زمانے میں غیر مسلم عورتیں مسجد کے باہر کھڑی رہتیں اور نمازیوں سے دم کرواتیں۔

اشفاق احمد کہتے ہیں برسوں جب میری پوتی کی حالت بہت ہی خراب ہوئی تو میں گھر سے کانچ کا گلاس لے کر مسجد گیا اور نماز کے بعد ہر نمازی سے دم کروایا واپسی پر یہ پانی بہو کو دیا تو وہ حیرت اور محبت سے بولی ''ابو وائرس اور جراثیم پر یہ پانی کس طرح سے اثر انداز ہوسکتا ہے، اس میں تو اپنے بہت سے جراثیم ہوں گے۔میں منیا کو اُبلا ہوا پانی دیتی ہوں، وہ بھی نکال دیتی ہے۔یہ پانی تو اس کے لئے بہت ہی خطرناک ہوگا''(۲۷) اشفاق چپ رہے تو بہو نے پانی گرایا نہیں احتراماً گملوں میں ڈال دیا اور اشفاق اس کے کمرے سے یوں نکلے جیسے گائتری کے گھر سے آخری بار نکلے تھے۔

اس افسانے میں اشفاق احمد بدلتے ہوئے اعتقادات پر روشنی ڈالتے ہیں۔کل تک غیر مسلم بھی قرآن پاک پر اعتقاد رکھتے کہ ماتھر جی الحمد شریف کے دم کا نام سنتے ہی مرعوب ہو گئے لیکن آج کے مسلمان کا بھی قرآن پاک پر اعتقاد نہیں بلکہ جراثیموں پر ہے۔یہ جدید دور کا تحفہ ہے کہ لوگ جراثیم کو خدا سے زیادہ طاقتور تصور کرنے لگے ہیں۔یہ روحانی اقدار کی پامالی کے مترادف ہے اور اس سے بڑی بات یہ کہ ایسے لوگوں کو سمجھانا ممکن نہیں رہا کہ یہ لوگ انسان کو اس کے ایمان سمیت جدت کے تناظر میں دیکھنے کے عادی ہیں۔خواہ یہ جدت روح فرسا ہی کیوں نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) پروفیسر سیّد وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۲۶۴

(۲) عرفان صدیقی، اشفاق احمد بھی روٹھ گیا!، مشمولہ: سیارہ ڈائجسٹ، لاہور: ریواز گارڈن، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۹

(۳) ڈاکٹر انور سدید، اُردو افسانے کی کروٹیں، لاہور: گنج شکر پرنٹرز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳۹

(۴) شازیہ صدف، اشفاق احمد کی ادبی خدمات، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ)، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۱

(۵) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو افسانہ نگار، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۲ء، ص ۲۷۷

(۶) انوار احمد، اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۴۲۴

(۷) ڈاکٹر مجیبہ عارف، نیا اردو افسانہ، متصوفانہ جہات، مشمولہ: دریافت، شمارہ نمبر ۱۲، اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، س۔ن، ص ۱۰۲

(۸) وزیر آغا، اشفاق احمد کے تین روپ، مشمول ماہنامہ ادب لطیف، اشفاق نمبر، جلد نمبر ۷۰، شمارہ ۵، لاہور: مکتبہ جدید پریس، مئی ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۶، ۲۱۷

(۹) اشفاق احمد، گڈریا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۱۹

(۱۰) ایضاً، ص ۱۹ (۱۱) ایضاً، ص ۲۱ (۱۲) ایضاً، ص ۳۶ (۱۳) ایضاً، ص ۴۸

(۱۴) ڈاکٹر انور سدید، مختصر اردو افسانہ عہد بہ عہد، لاہور: خورشید مقبول پریس، س۔ن، ص ۵۶

(۱۵) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۲۴

(۱۶) ایضاً، ص ۲۸

(۱۷) ثمینہ شہناز، اشفاق احمد کی افسانہ نگاری، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے)، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۰

(۱۸) اشفاق احمد، سفر مینا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۹۹، ۲۰۰۰

(۱۹) اشفاق احمد، طلسم ہوش افزا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۹

(۲۰) ایضاً، ص ۶۷

(۲۱) صائمہ غزل، طلسم ہوش افزا کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مشمولہ: قومی زبان، جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ۱، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، جنوری ۲۰۰۹ء، ص ۳۱، ۳۲

(۲۲) طلسم ہوش افزا، ایضاً، ص ۸۱

(۲۳) اشفاق احمد، صبحانے فسانے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۸۶

(۲۴) ایضاً، ص ۱۹۰ (۲۵) ایضاً، ص ۱۹۱ (۲۶) ایضاً، ص ۲۶۲ (۲۷) ایضاً، ص ۶۳

✿✿✿